

قسط ۲ (آخری)

وضع حدیث اور وضائین

نقد حدیث کے معیار:

لیکن بعد میں آنے والے ادوار میں جبکہ موضوعات کی گرم بازاری اور بڑھی تو یہ بنیادی اصول ناکافی ثابت ہوئے۔ اب علمائے حق نے ان اباطیل کا مقابلہ کرنے کے لیے ایسے ایسے طریق دریافت کر لئے جنہیں استعمال کرنے سے موضوع حدیث الگ ہو کر سامنے آجاتی تھی۔ لہذا فقہ وضع حدیث کو بالآخر محدثین کے سامنے مہتمم قرار دینے پڑے۔ وہ طریقے کیا تھے؟ یہ داستان بہت طویل اور الگ تفصیل کی متقاضی ہے جو میں کسی دوسری فرصت میں بیان کروں گا۔ مختصراً یہ کہ یہ طریقے دو قسم کے تھے۔ (۱) نظری اور (ب) عملی۔ اور یہ مختصراً درج ذیل ہیں:

(۱) نظری طریق:

سے مراد وہ قواعد ہیں جو موضوع حدیث کی پہچان کے لیے بنائے گئے۔ اس طریق کی پھر دو قسمیں ہیں۔ پہلی قسم کے قواعد متن حدیث یا روایت سے تعلق رکھتے ہیں اور وہ درج ذیل ہیں:

درایت کے اصول

۱- خلاف عقل ہو:

جیسے یہ حدیث کہ اللہ تعالیٰ نے گھوڑے کو پیدا کر کے اسے بھگایا تو اسے پسینہ آگیا۔ پھر اس پسینہ سے اپنے آپ کو پیدا کیا، یہ وضعی حدیث غالباً گھوڑے کی تعریف میں وضع کی گئی جس میں پہلے اللہ تعالیٰ کو خالق بیان کیا گیا ہے۔ پھر اس کی

نئی بھی کر دی گئی ہے گویا اس میں تضاد بھی ہے، غیر معقولیت بھی اور لغویت بھی!

۲- خلاف مشاہدہ ہو:

جیسے یہ حدیث کہ ”بینگن ہر مرض کی شفا ہے“ حالانکہ تجربہ اس کے خلاف ہے۔
۳- قرآن کی قطعی دلالت یا سند متواترہ یا اجماع قطعی کے خلاف ہو:
اور جمع و تطبیق کا بھی کوئی امکان نہ ہو۔ جیسے یہ حدیث کہ ”دنیا کی عمر سات ہزار برس باقی رہ گئی ہے“ یہ اس لیے وضعی ہے کہ قرآن کی صریح آیات کے خلاف ہے۔
لہذا قیامت کی مدت متعین کرنے والی اس قسم کی دوسری سب احادیث موضوع ہونگی۔
یا یہ کہ ”ولد الزنا جنت میں نہیں جائے گا“ یا یہ کہ ”جس شخص کا نام احمد یا محمد ہو وہ دوزخ میں نہیں جائے گا“ یہ سب احادیث وضعی ہیں۔

۴- عذاب و ثواب میں مبالغہ آرائی:

مثلاً یہ حدیث کہ: جو شخص لا الہ الا اللہ کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کلمہ سے ایک پرندہ پیدا کرتا ہے جس کی ستر ہزار زبانیں ہوتی ہیں.... لفظ الخیر۔ یا یہ کہ ”جو شخص حلال غسل جنابت کرے گا اسے اللہ تعالیٰ ہر قطرہ کے عوض ہزار شہید کا ثواب دے گا“ اور اسی قبیل کی دوسری روایات سب موضوع ہیں۔

۵- ایسا تاریخی واقعہ جو کسی اجتماع میں پیش آئے ہیں لیکن اس کے راوی ایک یا اقل قلیل تعداد میں ہوں۔ جیسے شیعہ کا وہ دعویٰ کہ رسول اللہ نے حضرت علیؑ کو حجۃ الوداع سے واپسی پر غدیر خم کے مقام پر خلافت عطا کی۔ حالانکہ اس واقعہ کے وقت ایک لاکھ سے زیادہ اصحاب موجود تھے لیکن شیعہ کے سوا اسے کسی نے روایت نہیں کیا، لہذا یہ حدیث وضعی ہے۔

۶- نسلی اور قومی تعصبات سے متعلق احادیث:

مثلاً یہ حدیث کہ ”ترکوں کا ظلم منظور ہے مگر عربوں کا عدل بھی مقبول نہیں“

۷- فرقہ وارانہ روایات:

شیعہ حضرات کی وہ روایات جو اہل بیت کے فضائل میں ہیں، یا دوسرے صحابہ کے خلاف ہیں۔ مثلاً ان کی یہ روایت کہ ”حضرت ابو بکرؓ اور عمرؓ نے حضرت علیؑ سے خلافت چھین لی تھی“ یا یہ حدیث کہ: ”میرے اہل بیت کی مثال نوحؑ کی کشتی کی طرح

ہے جو اس میں سوار ہوا نجات پائیگا اور جو بیچھے رہ گیا وہ غرق ہوا اور دھنس گیا۔“ یا یہ حدیث کہ ”میری امت میں ایک شخص محمد بن ادریس ہوگا جو میری امت کے حق میں شیطان سے بھی زیادہ مضر رساں ہوگا۔“ واضح رہے کہ یہ محمد بن ادریس ”امام شافعی“ ہیں۔ یا یہ حدیث کہ ”میری امت میں ایک شخص پیدا ہوگا جسے ابو حلیفہ کہا جائے گا وہ میری امت کا چراغ ہوگا۔“ یہ وضعی حدیث ”ابو حلیفہ سراج اُمّی“ کے الفاظ سے مشہور ہے۔

۸۔ تاریخ کے خلاف ہو:

مثلاً اہل خبیر سے جزیرہ وضع کرنے کی حدیث جس میں وضاع نے حضرت سعد بن معاذ کی شہادت کو بھی شامل کر دیا۔ اس میں دو تاریخی لغزشیں ہیں۔ ایک یہ کہ حضرت سعد بن معاذ، جنگ خندق (۵ھ) کے موقعہ پر فوت ہوتے تھے دوسرے، جزیرہ کا حکم ۹ھ میں غزوہ تبوک کے بعد نازل ہوا تھا۔

۹۔ راوی کا غیر طبعی طویل عمر کا دعویٰ:

جیسے کہ چھٹی صدی ہجری میں رتن ہندی کا یہ دعویٰ کہ ”وہ رسول اللہ سے بل چکا ہے اور صحابی ہے“ حالانکہ یہ بات مسلمہ ہے کہ آخری صحابی ابو الطفیل عامر بن واکہ ہیں جنہوں نے ۱۰۲ھ میں وفات پائی۔ لہذا رتن ہندی کی سب مرویات موضوع ہیں۔

اسی طرح کے ایک ”صحابی“ جبیر بن حرب چھٹی صدی کے ہیں۔ ان کے متعلق مشہور تھا کہ وہ جنگ خندق میں شریک تھے۔

یا ابو عبد اللہ الصقلی پانچویں صدی ہجری کا ”صحابی“ ہے اس کے بارے میں مشہور تھا کہ اس نے رسول اللہ سے مصافحہ کیا ہے۔

نیز قیس بن تمیم کیلانی بھی چھٹی صدی ہجری کا ”صحابی“ ہے۔ جس کی پیشانی پر ایک نشان تھا اور مشہور یہ تھا کہ حضرت علیؑ کی خچر نے اس کی پیشانی پر لٹائی تھی۔ محمد بنی نے ایسے تمام بناوٹی صحابیوں کا پورا تعاقب کیا۔ ان کو وضاع اور ان کی مرویات کو موضوع قرار دیا اور انہیں تصانیف میں بالخصوص ان کا ذکر کر دیا۔

۱۰۔ کشف و رُویا پر مبنی روایات:

ایسی روایات طبقہ صوفیہ کی خود ساختہ ہوتی ہیں جو جھتے ہیں کہ کشف یا خواب میں میری رسول اللہ سے ملاقات ہوئی اور انہوں نے یوں فرمایا یا یہ کام کیا۔ لہذا ایسی تمام روایات موضوع ہیں کیونکہ یہ مسلمہ امر ہے کہ رُویا یا کشف سے کسی شرعی حقیقت کا اثبات نہیں ہوتا۔

۱۱۔ رکاحت لفظی یا معنوی:

رکاحت لفظی کا تعلق زیادہ تر ذوق سے ہوتا ہے جیسے اقبال کا گہری نظر سے مطالعہ کرنے والے حضرات اس کا کلام پہچان لیتے ہیں۔ اسی طرح محدثین لفظوں سے ہی اس فصیح العرب والعم کا کلام پہچان لیتے ہیں اور معنوی رکاحت یہ ہے کہ اس حدیث کے مضمون کی کوئی شرعی بنیاد نہ ہو۔ جیسے یہ روایت کہ مرغ کو گالی نہ دو کہ وہ میرا دوست ہے، یا یہ کہ: ”اگر چاول آدمی ہوتے تو بڑے بڑے ہوتے۔“

اس مقام پر یہ تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہو گا کہ جناب حافظ اسلم صاحب پیراجوری نے مقام حدیث میں دو مقامات پر ص ۱۰۶ اور ص ۱۵۴ پر درایت کے ان اصولوں کا ذکر فرمایا ہے۔ پہلے مقام پر آٹھ اصول لکھے ہیں دوسرے مقام پر سات۔ البتہ تیسرے قاعدہ کہ ”وہ قرآن کی قطعی دلالت یا سنت متواترہ یا اجماع قطعی کے خلاف ہو“ کو دونوں مقامات پر مختصر کر کے صرف اتنا لکھ دیا ہے کہ ”قرآن کے خلاف ہو“ یہ اختصار کیوں کیا گیا؛ اس کی وجہ آپ بھی سمجھتے ہیں۔ نقل میں ایسی من مانی، علمی خبیثت نہیں تو اور کیا ہے؟

نظری طریق کی دوسری قسم:

روایت یا اسناد کی چھان چھٹک کے اصول:

یہ مضمون الگ تفصیل کا محتاج ہے۔ سر دست ہم چند اشارات پر اکتفا کریں گے۔ اس سلسلہ میں محدثین کرام نے مندرجہ علوم کی داغ بیل ڈالی:

(۱) علم الجرح والتعديل:

اس علم کی بنیاد یہ ہے:

”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَأٍ فَانظُرُوا“ (۱)

”اے ایمان والو! جب کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو اس کی تحقیق کر لیا کرو“ لہ

اس علم کی رو سے ہر ایک راوی کے عدل اور ضبط پر بحث کی جاتی ہے۔ ماسوائے صحابہؓ کے کہ ان کے متعلق متفق علیہ اصل یہ ہے کہ وہ سب کے سب عادل ہیں۔ لیکن جہاں تک ضبط اور حافظہ کا تعلق ہے وہ بھی اس قاعدہ سے مستثنیٰ نہیں۔ اس علم کا آغاز دور صحابہؓ میں ہی ہو گیا تھا۔ صحابہؓ میں سے حضرت ابن عباسؓ (م ۶۸ھ) عبادہ بن صامتؓ (م ۳۴ھ) انس بن مالکؓ (م ۹۳ھ) نقد و جرح کے امام تھے۔ پھر تابعین میں سے عامر شعبیؓ (م ۱۰۴ھ) ابن سیرینؓ (م ۱۱۰ھ) اور سعید بن اسیبؓ (م ۹۳ھ) یکتائے روزگار تھے۔ بعد میں آنے والے ناقدین کی فہرست بہت طویل ہے جس کی یہاں گنجائش نہیں۔

۲۔ علم التاریخ والرواۃ :

اس میں راویوں کے حالات زندگی سے بحث کی جاتی ہے۔ یعنی فلاں راوی کب پیدا ہوا۔ حدیث سننے کا آغاز کب کیا؛ کس کس محدث سے ملا اور کس کس شہر میں گیا۔ حافظہ کی صورت حال کیا تھی؛ اگر پہلے ٹھیک تھا تو کب ذہول ہوا؛ کون سی احادیث خرابی حافظہ سے پہلے کی سنی ہوئی ہیں اور کون سی بعد میں اور کب اور کہاں فوت ہوا؛ اس علم سے محنتی فائدے ہوتے۔ ایک تو موضوع احادیث کا پتہ چل جاتا تھا۔ دوسرے سند کے متصل یا منقطع ہونے کا۔ تیسرے سند میں تدلیس کا۔

ابامسلم اپنے مقدمہ میں روایت کرتے ہیں کہ ”معلیٰ بن عرفان نے ابو وائل کے واسطے سے یہ حدیث سنائی کہ ”حضرت عبداللہ بن مسعودؓ جنگ صفین میں ہمارے پاس آئے۔“ یہ حدیث سن کر معلیٰ ہی کے ایک شاگرد ابو نعیم فضل بن رکن نے برجستہ کہہ دیا کہ ”کیا حضرت عبداللہ بن مسعودؓ دوبارہ زندہ ہو گئے تھے؟“ اس طنز میں اس تاریخی لغزش کی طرف اشارہ تھا کہ عبداللہ بن مسعودؓ تو ۳۲ھ میں دور عثمانی میں فوت ہو گئے تھے۔ پھر وہ جنگ صفین، جو حضرت علیؓ کے دور خلافت میں ہوئی، کیسے شامل ہو سکتے تھے؟

لے قاعدہ اتنا اہم ہے کہ اس پر تنقید کی بنیاد رکھی گئی تھی جسے ہم فتح الملہم شرح صحیح مسلم کے حوالہ سے پہلے

اسماعیل بن عیاش نے ایک آدمی سے دریافت کیا کہ آپ نے خالد بن معدان سے کس سال حدیثیں سنیں؟ اُس نے کہا ”۱۱۳ھ میں“ اسماعیل کہنے لگے ”گویا تمہارا دعویٰ یہ ہے کہ تم نے خالد سے اس کی موت کے سات سال بعد سماع کیا۔“
چونکہ یہ خالد بن معدان ۱۰۶ھ میں وفات پا گئے تھے۔

محمد بن حاتم الکشی نے عبد بن حمید سے حدیث روایت کی تو امام حاکم نے اس کا سن و ولادت دریافت کیا۔ اس نے کہا ”۲۶۰ھ“ یہ سن کر امام حاکم کہنے لگے کہ ”اس شخص نے عبد بن حمید کی وفات سے تیرہ سال بعد اس سے حدیث سنی“ سفیان ثوری کہا کرتے تھے ”جب راویوں نے کذب بیانی سے کام لینا شروع کیا تو ہم تاریخ سے فائدہ اٹھانے لگے“ اور حسان بن یزید کہتے تھے کہ ”جھوٹے راویوں کے خلاف جتنی مدد ہمیں تاریخ سے ملی ہے اور کئی چیز سے نہیں ملی“

۳۔ معرفۃ الصحابہ:

اس میں صحابہ کے نام، القاب اور کنیتوں وغیرہ سے معرفت حاصل کی جاتی ہے۔ اس علم کے ذریعہ کسی حدیث کے متصل یا مرسل ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ اس فن سے محدثین کی ابتداء ہی سے گہری دلچسپی رہی ہے اور اس پر بے شمار تصانیف شائع ہو چکی ہیں۔

۴۔ علم الاسماء والکنی:

اس میں عام راویوں کے نام، القاب اور کنیت سے متعلق علم حاصل کیا جاتا ہے۔ بعض دفعہ ایک راوی، اس کے باپ اور دادا تک کے نام دوسرے راوی سے مل جاتے ہیں۔ کبھی کنیت ایک ہوتی ہے۔ پھر بعض لوگ اپنی کنیت یا لقب بدلتے بھی رہتے ہیں۔ جب تک ان سب امور کی پوری تحقیق نہ ہو تدلیس اور اشتباہ کا امکان باقی رہتا ہے۔

غرض درایت کے پہلو کے لحاظ سے بہت سے علوم معرض وجود میں آ گئے۔ جن میں چند کا ذکر ہم نے کر دیا ہے۔ ان علوم سے جہاں موضوع احادیث کو دریافت کرنے میں مدد ملی۔ وہاں کسی حدیث کے صحت و سقم کے لحاظ سے درجات

متعین کرنا بھی میسر آگیا۔ اور اس طرح

ح عدو شرے برانگیز دکھ خیرے مادران باشد

کے مصداق ان علوم سے جہاں موضوعات کا ستر باب ہوا۔ وہاں یہ دوسرا فائدہ
از خود سامنے آگیا کہ اگر وضائین حدیثیں نہ کھڑے تو محدثین کو چھان پھٹک کے
ایسے کڑے معیار تلاش کرنے کی شاید ضرورت ہی پیش نہ آتی۔

(ب) عملی طریقہ:

عملی طریقہ یہ ہے کہ محدثین نے ان وضائین کے ناموں کا برملا اعلان کیا اور ان کی
بیان کردہ موضوعات پر روشنی ڈال کر ان کو موضوع ثابت کیا۔ ان موضوعات کو
اسی طرح حفظ کیا جس طرح صحیح احادیث کو۔ تاکہ عوام کو ہر طرح سے آگاہ کر سکیں۔

امام بخاری سے پہلے دور میں یحییٰ بن معین اور امام احمد بن حنبلہ نقد حدیث کے
امام سمجھے جاتے ہیں۔ ایک دفعہ لوگوں نے دیکھا کہ یحییٰ بن معین کچھ حدیثیں لکھ رہے ہیں
لیکن جب کوئی ان کے پاس آکر بیٹھتا تو وہ اس مکتوبہ کو ایک طرف رکھ دیتے۔
کسی نے پوچھا آپ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ ”میں ان تمام
موضوع احادیث کو لکھ رہا ہوں جن کا راوی ابان ہے۔ وہ اپنی جگہ کسی دوسرے نکتہ
راوی کا نام بتا کر لوگوں کو آسانی سے دھوکہ میں مبتلا کر سکتا ہے۔ لہذا ہمارے لیے یہ
ضروری ہے کہ ہم لوگوں کو اصل حقیقت حال سے آگاہ کریں“ ہمارے علم کی حد تک موضوع احادیث
کا یہ پہلا تحریری مجموعہ تھا۔ اس کے بعد بیسٹار کتابیں اس خاص موضوع پر لکھی گئیں۔ جن
میں سے درجن سے زیادہ آج کل بھی متداول ہیں۔

یہ تھا محدثین کرام کی مساعی جمیلہ کا مختصر تذکرہ، کس طرح انہوں نے ان موضوعات
کو الگ کر کے صحیح احادیث کو الگ کیا اور انسانی حد تک اس میں اپنی پوری کوششیں
اور زندگیاں صرف کر دیں۔ اس کے باوجود کچھ لوگ جانتے ہیں کہ ان تمام تر کوششوں
کے باوجود یہ دعویٰ غلط ہے کہ انہوں نے موضوعات کو صحیح احادیث سے الگ
کر کے دو دھکا دو دھکا اور پانی کا پانی کر دیا ہے اور اب بھی بہت سی موضوعات صحیح
احادیث کے مجموعوں میں ملی ہوئی ہیں۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ سب انسانی کوششیں
ہیں اور انسانی کوششوں میں بہر حال غلطی کا امکان باقی رہتا ہے۔

نظر یہ کی حد تک ان کا یہ اعتراض مسلم۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اتنی تکلیف کب دی ہے کہ جب تک ہر معاملہ کی جزئیات تک لیقینی کیفیت پیدانہ ہو جائے وہ اس پر عمل پیرا نہ ہو؛ عام مسلمانوں کی بات چھوڑتے۔ خود رسول اللہ نے تنازعات کے جو فیصلے کئے وہ مدعیوں اور گواہوں کے انہی ظنی بیانات پر سے کیے۔ اور اس بات کو آپ نے خود بھی بر ملا الفاظ میں بیان فرمایا کہ ”کوئی شخص جو بانی سے میرے سامنے دوسرے کا حق غضب کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ تو وہ یہ خوب سمجھ لے کہ وہ اپنے بھائی کا حق نہیں لے رہا بلکہ جہنم کی آگ کا ٹکڑا لے رہا ہے“ انہی ظنی بیانات پر آپ نے فیصلے کیے لیکن ان فیصلوں کی دینی حیثیت سب کے ہاں مسلم ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا تو خیر معاملہ ہی الگ ہے کہ آپ سے کسی نزاع کے فیصلہ میں غلطی کے صدور کا امکان نہیں۔ لیکن ایک عام قاضی سے فیصلہ میں غلطی بھی ممکن ہے۔ گویا گواہوں کے بیانات بھی ظنی ہو سکتے ہیں اور قاضی کے فیصلہ میں غلطی بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن ان دونوں باتوں کے باوجود اس کا فیصلہ نافذ العمل ہوتا اور مکمل شرعی حیثیت رکھتا ہے۔ بشرطیکہ قاضی نے یہ فیصلہ خلوص نیت اور اپنی پوری کوشش سے کیا ہو۔ گویا کسی معاملہ کی دینی حیثیت معلوم کرنے کے لیے مجتہد میں مہارت و مہارت، امکان بھر کوشش اور خلوص نیت انہی تین باتوں کو معلوم کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے بعد بھی اگر غلطی ثابت ہو جائے تو انسان اس کا مکلف نہیں۔ حضرت عمرؓ کے زمانے کا واقعہ ہے کہ ایک دفعہ رمضان میں بادل کی وجہ سے آفتاب کے چھپ جانے کا دھوکا ہوا۔ حضرت عمرؓ نے روزہ کھول لیا۔ تھوڑی دیر کے بعد آفتاب نکل آیا۔ لوگ سڑو ہوئے تو حضرت عمرؓ نے فرمایا:

«الْحَطْبُ يَسِيرٌ وَقَدْ اجْتَمَعْنَا»

”معاملہ چنداں اہم نہیں۔ ہم اپنی طرف سے پوری کوشش کر چکے تھے۔“

(الفاروق - شبلی مطبوعہ سنگ میل پبلیکیشنز، ص ۳۵۰ بحوالہ موطا امام محمدؓ ص ۱۸۴)
حضرت عمرؓ کے اس مجتہدانہ قول سے صاف ظاہر ہے کہ کسی بھی دینی معاملہ کی تحقیق میں انسان اسی حد تک مکلف ہے جو اس کی امکانی کوششوں کے دائرہ میں ہو۔

اب یا تو یہ بتلایا جائے کہ محدثین کرام نے احادیث کی تحقیق و تنقید میں کوئی کسر اٹھا رکھی اور پوری امکانی کوششوں سے کام نہیں لیا لیکن اگر اس بات کا جواب نفی میں ہے تو پھر لا محالہ یہ اقرار کرنا پڑے گا کہ حجت قائم ہو چکی ہے۔

پھر کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جنہوں نے کہا کہ ”محدثین کی یہ مساعی جمیلہ سرانگموں پر اور ان کے قواعد جرح و تعدیل اور روایت درایت مسلم۔ لیکن یہ حرف آخر نہیں۔ ان اصولوں میں معقول طریقہ سے اضافہ کیا جاسکتا ہے۔“ دلیل ان کی بھی وہی ہے جو پہلے فریق کی ہے۔ فطری حد تک ان کا یہ اعتراض بھی مسلم۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ایسے لوگوں نے کبھی کوئی ”معقول طریقہ والا اضافہ“ تجویز بھی فرمایا ہے، اگر وہ فی الواقعہ معقول بھی ہو اور نقد حدیث کے سلسلہ میں مفید بھی، تو اہل العلم اتنے تنگ نظر نہیں کہ وہ ایسے معقول اور مفید طریقہ تنقید کو ماننے سے انکار کر دیں۔

موجودہ دور میں وضع حدیث:

ہمارے خیال میں محدثین کے دریافت کردہ اصول، نقد حدیث اور بالخصوص کسی موضوع حدیث کی چھان پھٹک کے لیے آج بھی ویسے ہی کافی ہیں جیسے ان ادوار میں تھے۔ نیز موضوع حدیث کی چھان پھٹک اور رسول اللہ سے منسوب جھوٹ کو دور کرنے کی آج بھی امت مسلمہ کی اسی طرح ذمہ داری ہے جیسی کہ خود آپ کے اپنے زمانہ یا مابعد کے ادوار میں تھی۔ اب اگر آج پرویز صاحب اپنے اعتراض خوردہ قرآنی نظام ربوبیت — جو ظاہری طور پر کمیونزم کا متحمل جبر ہے — کے متعلق یہ کہہ دیں کہ:

”آج دنیا حیران ہے کہ محمد رسول اللہ والذین معہ کی قلیل سی جماعت نے اتنے مختصر عرصہ میں ایسی عجیب العقول ترقی کس طرح کر لی تھی؟ دنیا حیران ہے اور اس کے لیے تحقیقاتی ادارے قائم کرتی ہے لیکن اسے معلوم نہیں کہ رسول اللہ نے وہ معاشرہ متشکل کیا جو قرآنی نظام ربوبیت کا حامل تھا“ (قرآنی نظام ربوبیت ص ۱۸۰)

تو پرویز صاحب کی اس بات کو بھی ہم انہی اصولوں کی رو سے رکھ سکتے ہیں اور یہ کہہ سکتے ہیں کہ چونکہ یہ فعل منسوب الی الرسول ہے۔ لہذا حدیث کی تعریف میں

آتا ہے اور سنت فعلی ہے۔ تاہم درج ذیل وجوہ کی بنا پر موضوع ہے۔
۱۔ تاریخ کے خلاف ہے۔ احادیث یا تاریخ کی کسی کتاب سے اس ”نظام ربوبیت“ کا سراخ نہیں ملتا۔

۲۔ اس واقعہ کا تعلق انسانی زندگی کے سب سے اہم پہلو سے ہے۔ اگر رسول اللہ نے یہ نظام قائم کیا ہوتا، تو اس کے بجزت راوی ہونے چاہئیں تھے۔ جبکہ صورت حال یہ ہے کہ سرے سے اس کا کوئی راوی ہی نہیں۔

لہذا پرویز صاحب کا یہ قول موضوع حدیث ہے۔ مزید برآں چونکہ یہ منسل منسوب الی الرسول ہے مگر بلا سند ہے۔ لہذا یہ ویسے بھی مردود ہے۔

اسی طرح ادارہ طلوع اسلام نے کئی مقامات پر دعویٰ کیا ہے کہ:

”جب نبی اکرمؐ اس دنیا سے تشریف لے گئے ہیں تو یہ (قرآن)

بعینہ اسی شکل و ترتیب میں، جس میں یہ اس وقت ہمارے پاس

ہے لاکھوں مسلمانوں کے پاس موجود تھا۔ اس کی مستند کاپی مسجد نبویؐ

میں ایک ستون کے قریب صندوق میں رکھی رہتی تھی، یہ وہ نسخہ

تھا جس میں سب سے پہلے وحی لکھوایا کرتے تھے“ (طلوع اسلام فروری ۸۲ء)

یہ فعل بھی منسوب الی الرسول ہے اور یہ سنت فعلی بھی ہے اور تقریری بھی۔ اور

اس حدیث کے موضوع ہونے کے لیے مندرجہ بالا دونوں وجوہ کے علاوہ ایک

تیسری وجہ یہ بھی ہے کہ قرآن کریم موجودہ ترتیب کے لحاظ سے نازل نہیں ہو رہا تھا۔

بلکہ کئی کئی سورتوں کے مضافین ایک ہی دور میں نازل ہو رہے تھے۔ لہذا مکمل

نزول سے پہلے اس کا موجودہ ترتیب سے ہونے کا تصور ہی ناممکن ہے۔ اور جب

تذریل مکمل ہوتی تو فوراً بعد ہی آپ رحلت فرما گئے۔

اس وقت ہمارا یہ مقصد نہیں کہ پرویز صاحب یا ادارہ مذکور کی تمام موضوعات

کو پیش کریں (اور اگر ایسا کریں تو بلاشبہ ایک دفتر تیار ہو سکتا ہے) بلکہ مقصد صرف

یہ ہے کہ آج بھی اقوال و افعال منسوب الی الرسول کا وجود پایا جاتا ہے۔ اور اس

میں صرف ”طلوع اسلام“ ہی نہیں کئی دوسرے ہجرات بھی شریک ہیں۔

۱۔ موضوع حدیث کے لیے یہ تو ضروری نہیں کہ وہ عربی زبان میں ہو یا بمعہ اسناد ہو۔ آخر

فلہذا آج بھی مسلمانوں پر ان کے دفاع کی ویسی ہی ذمہ داری عائد ہوتی ہے جیسی پہلے ادوار میں تھی۔ بالخصوص جبکہ آج ہمیں یہ سہولت بھی میسر ہے کہ معیار کے لیے اصول و قواعد پہلے سے موجود ہیں لیکن ناقدرین سابقین کو ایسے اصول و قواعد وضع کرنے میں بھی بہت سی دماغی کاوشوں سے کام لینا پڑا تھا۔

بنادٹی صحابی جو روایات فرماتے تھے، وہ بھی تو بلا سند ہی ہوتی تھیں۔ ان بے پاروں کے تخیل کی پوز صحابیت تک ہی تھی۔ لیکن طلوع اسلام نے مرکزِ ملت کا تصور پیش کر کے خدا اور رسول کا مقام سنبھال لیا ہے۔ تو پھر آخر اسے کسی منسوب الی الرسول بات کے لیے اسناد کا سہارا لینے کی ضرورت بھی کیا ہے؟ تاہم اس نے بھی یہ اغفال رسول اللہ کی طرف منسوب کرنے کی ضرورت اس لیے محسوس کی ہے کہ انکارِ حجیتِ حدیث کے باوجود، وہ بھی بالواسطہ حجیتِ حدیث کی اہمیت کو خوب سمجھتا ہے۔ فتنہ کر!

جناب قاری نعیم الحق نعیم

غملہ

مشرد ادب

دو دلوں کا ربط باہم ہو گیا
 غم کی دولت کو ترستا تھا بہت
 غم کے آنسو یا خوشی کے اشک تھے
 دن بھی راتوں کی طرح تاریک ہیں
 تیز تر ہوتی گئی باہر کی شمع
 درو بڑھتے جا رہے ہیں سب کے سب
 دم کیا ایسا سیح وقت نے
 آنکھ سے موتی گرا جو بھی نعیم!
 سنگریزوں میں ہی مدغم ہو گیا!